جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

مولانا مسعود عالم ندویؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

ہر سکوں کی تہہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

”ہم ان نظریوں کی تنقید و تنقیح پر مجبور ہیں جو کتاب و سنت کے صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ خواہ اس میں جذبات محبت و عقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو کہ حق کی تائید تعلقات و محبت کی پاسداری پر مقدم ہے۔[۳۴]“

(مسعود عالم ندوی)

مسعود عالم ندوی

اوائل زندگی اور علم کی تڑپ: مسعود عالم ندوی 11 فروری 1910 کو صوبہ بہار کے ایک دیہات اوگاؤں کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تنگ دستی کے باوجود تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی گئی، والد ماجد کی نگرانی میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ بہار شریف منتقل ہونے کے بعد بھی عربی والد صاحب سے ہی پڑھتے رہے البتہ ایک ہائی اسکول میں بھی داخل ہوئے۔ میٹرک سے پہلے انھیں مدرسۂ عزیزیہ میں داخل کرایا گیا جہاں سے فراغت کے بعد مسعود عالم پٹنہ چلے گئے اور مدرسہ شمس الھدی میں داخلہ لیا۔ تبھی والدہ کے انتقال اور کھانسی کے شدید مرض سے دل برداشتہ ہو کر گھر آ گئے۔ علم کی تڑپ نے چین نہ لینے دیا اور مسعود عالم نے سید سلیمان ندوی سے خط وکتابت شروع کی بعد ازاں انہی کی ایما پر جولائی 1928 کو ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ 1929 میں نمایاں نمبرات کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔ بچپن ہی سے مسعود عالم کو عربی زبان سے لگاؤ تھا چنانچہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے زمانے سے ہی عرب ممالک کے بیشتر مجلّات کا پابندی سے مطالعہ کرنے کی عادت ڈال لی تھی۔ ندوہ میں القائد کے نام سے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ فراغت کے باوجود عربی ادب کو مزید مستحکم کرنے کی خاطر ندوہ میں رک گئے، کتب خانے، رسائل وجرائد کھنگال ڈالنے کے علاوہ ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا جس پر سند سے نوازے گئے۔ اس کے بعد گھر آئے، میٹرک کا امتحان دیا، پھر آگے ایف اے (ہائر سیکنڈری) کی تیاریوں میں جٹ گئے۔ غرض اس زمانے تک اردو، عربی اور انگریزی میں تحریر وتقریر کا زبردست ملکہ پیدا کر لیا تھا۔

مدیر سے کیٹلاگر تک: باوجود یہ کہ مسعود عالم ندوہ سے عربی ادب کی ڈگری حاصل کر چکے تھے، جب انھوں نے اطلاع پائی کہ سید سلیمان ندوی کی گزارش پر عرب سے شیخ تقی الدین ہلالی، جو صرف ونحو میں سند کا درجہ رکھتے تھے، ندوہ میں عربی کے استاد ہو کر آرہے ہیں تو انھوں نے کالج کی

پڑھائی کا ارادہ ترک کر دیا اور ندوہ جا کر شیخ کا تلمذ حاصل کیا۔ مئی 1932 میں عربی ماہنامہ الضیاء جاری ہوا جس کی ادارت کے لیے سید سلیمان ندوی اور تقی الدین ہلالی نے مولانا مسعود عالم ندوی کو چنا۔ پتھر پر چھپنے والا اور معمولی سا نظر آنے والا یہ رسالہ زبان کی صحت اور معیار کے ساتھ ساتھ مضامین کی گہرائی کی وجہ سے کافی مقبول ہوا۔ عرب ممالک میں الضیاء اور اس کے نوخیز مدیر کا طوطی بولنے لگا۔ الضیاء چار سال تک پورے آب و تاب سے جاری رہنے کے بعد منتظمین ندوہ کے عتاب کا شکار بنا۔ 1934 میں اسے بند کر دیا گیا۔ اسے اپنے بل بوتے پر جاری رکھنے کی مسعود عالم کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ مسعود عالم ندوی اب محض تاریخ و ادب کے ایک مدرس بن کر رہنے لگے۔

منتظمین ندوہ کی پالیسیاں ندوہ کے خیر اندیشوں کو راس نہیں آ رہی تھیں؛ الضیاء کو بند کرنا، نصاب سے انگریزی ہٹانے کی کوشش، اور دیگر من مانی کارروائیوں کا نتیجہ 1935 میں طلبائی اسٹرائک کی صورت میں نکلا۔ یہ 'بغاوت' ناکام ہوئی اور منتظمین کا نزلہ تین طالبعلموں اور ایک مدرس پر گرا جن کا مدرسے سے اخراج ہوگیا۔ مسعود ندوی کو ندوہ کے احاطے سے باہر رہنے کا حکم ہوا۔ اس غلیظ سیاست پر ان کا دل کڑھتا رہا، بالآخر بددل ہو کر جون 1937 کو انھوں نے تین ماہ کی رخصت لی اور بجنور جا کر مدینہ کی ادارت سے منسلک ہوگئے۔ یہ خالص صحافتی زندگی ان کے ذوق پر گراں تھی، سید سلیمان ندوی کے حکم پر دوبارہ ندوہ آئے لیکن دسمبر 1937 میں انہی کی ایما پر خدابخش لائبریری پٹنہ میں بحیثیت کیٹیلاگر ملازمت اختیار کر لی۔ لائبریری کی آزاد اور علمی فضا میں ان کے علمی جواہر کو کھل کر منظر عام پر آنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں وہ قاہرہ کے الفتح نامی رسالے کے مستقل مضمون نگار رہے۔ معارف میں بھی ان کے کئی مضامین چھپے جن میں شکیب ارسلان کی کتاب کے خلاصے سے لے کر اشتراکیت اور اسلام پر طویل بحثیں شامل ہیں۔ ندوہ کی اصلاح کے لیے وہ حتی المقدور کوششیں کرتے رہے، 1938 میں انجمن طلبہ قدیم کی بنیاد ڈالی۔ پٹنہ میں نوجوانوں میں دعوت و اصلاح کا کام بھی کر رہے تھے، عربی زبان سیکھنے کی عام دعوت دے رکھی تھی۔ **محمد بن عبد الوھاب: ایک مظلوم و بدنام مصلح اور ھندوستان کی پھلی اسلامی تحریک** وغیرہ شاہکار تصانیف اسی دور کی یادگار ہیں۔

تحریک اسلامی کا سفیر: مسعود عالم ندوۃ العلماء کے زمانے ہی سے ماہنامہ ترجمان القرآن کے مداح تھے، سلفی المسلک تھے لیکن فروعی معاملات میں الجھنا، الجھانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ تشکیل

جماعت اسلامی کے وقت اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے رکن بننے سے ہچکچا رہے تھے لیکن مولانا مودودی کے ایک خط نے الجھن رفع کردی اور آپ 1941 میں ہی جماعت سے بحیثیت رکن وابستہ ہو گئے، وابستگی کے فوراً بعد صوبہ بہار کی جماعت کے امیر مقرر کیے گئے۔

مولانا مودودی کے فکری مضامین ہندوستان بھر میں آگ لگائے ہوئے تھے لیکن عرب دنیا اس پکار سے نا آشنا تھی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے مولانا مودودی ایک عربی مجلہ نکالنے کے خواہش مند تھے۔ اس وقت جماعت کے رکن علی میاں ندوی نے تحریکی کتابوں کے عربی ترجمے اور عربی رسالے کی ادارت کے لیے مولانا مسعود عالم ندوی کا نام پیش کیا۔ مسعود عالم اس آزمائش میں بھی کھرے اترے اور خدا بخش لائبریری کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر تحریک کے لیے ہمہ تن وقف ہو گئے۔ نومبر 1944 کے اخیر میں پنجاب روانہ ہوئے اور جالندھر میں **دارالعروبہ للدعوۃ الاسلامیہ** کا قیام عمل میں آیا۔ انتظامی دشواریوں کی وجہ سے عربی رسالہ تو نہ نکلا لیکن مولانا مودودی کی کتابوں کے عربی تراجم چھپنے لگے۔ دارالعروبہ کے سربراہ کے علاوہ مسعود عالم جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے۔ 1948 میں جب مولانا مودودی جیل میں تھے تب مولانا مسعود عالم ندوی نے شوری کے اصرار پر قائم مقام امیر جماعت کے فرائض بھی انجام دیے۔

دو ڈھائی سالوں میں اندازہ ہوا کہ اس دعوت کو عرب ممالک تک کما حقہ پہنچانے کے لیے عرب ممالک کا دورہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ انھوں نے جماعت سے چھ ماہ کا پیشگی معاوضہ لیا (یعنی سفر خرچ کے لیے جماعت سے رقم نہیں لی) اور بصرہ روانہ ہو گئے۔ 28 اپریل سے 13 دسمبر 1949 تک کے سفر کی روداد **دیار عرب میں چند ماہ** کے نام سے چھپ کر اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ بصرہ سے بغداد گئے جہاں تقی الدین ہلالی سے ملاقات ہوئی جو اب مسعود عالم کے استاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ ہلالی کے زور دینے پر حج کا ارادہ بن گیا۔ کویت اور ریاض سے ہوتے ہوئے مکہ اور مدینے میں حاضری دی اور حج کی سعادت حاصل کی۔ یہ سفر تحریک اسلامی کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کے لحاظ سے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ ان کا ارادہ آئندہ دمشق میں قیام کر کے یہیں سے دارالعروبہ کے کام کو آگے بڑھانے کا تھا لیکن وطن واپسی کے بعد دمہ کا مرض عود کر آیا، آب و ہوا کی وجہ سے گوجرنوالہ منتقل ہونا پڑا، یہاں افاقہ نہ ہوتا دیکھ دارالعروبہ کے ساتھ مئی 1951 میں راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ نومبر 1951 میں جماعت کے سالانہ اجتماع میں دو وقیع مقالے پڑھے۔ جماعت اسلامی پاکستان پر جب

تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں ابتلا و آزمائش کا دور آیا تو مسعود عالم ندوی کو بھی 28 مارچ 1953 کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت مرض کے شدید دورے پڑ رہے تھے، باوجود اس ناسازی کے وہ مولانا مودودی کی کتاب پردہ کے ترجمے میں مشغول تھے۔ چار ماہ تک جیل میں رہے جہاں سونے، کھانے، پینے کے معمولات بری طرح متاثر ہوئے اور صحت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی خودداری نے مرض کا حوالہ دے کر ظالموں سے رحم کی درخواست کرنے کی اجازت نہ دی اور وہ صبر و استقامت کے ساتھ ساری صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ جیل کے اوقات کو احادیث کے مطالعے کے لیے استعمال کیا۔ بالآخر 2 اگست 1953 کو رہا ہوئے۔ رہا ہونے کے بعد طبیعت اور بگڑ گئی، اسی اثنا میں استاد سید سلیمان ندوی کی رحلت نے انھیں مزید نڈھال کردیا۔ یکم مارچ 1954 کو کراچی گئے جہاں شوری کا اجلاس تھا۔ یہ منصوبہ بھی ذہن میں تھا کہ اگر جماعت نے اجازت دی تو مصر و شام کے دورے پر روانہ ہوجائیں گے۔ 14 مارچ سے اجلاس شروع ہوا لیکن 16 مارچ کو مرض کا غیر معمولی طور پر شدید دورہ پڑا اور اسی شام کو مولانا مسعود عالم ندوی 44 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

کارنامے: مولانا مسعود عالم ندوی کو قلم برداشتہ تحریروں میں غضب کا ملکہ حاصل تھا، علی میاں جیسے عربی داں تک ان کی عربی دانی کا لوہا مانتے تھے۔ ایجاز و اختصار کے ساتھ ساتھ قوت و بلاغت ان کی تحریروں کی جان تھی۔ مولانا مودودی کی جن کتابوں کو انھوں نے عربی میں منتقل کیا ہے ان پر 'ترجمہ' ہونے کی تہمت بمشکل ہی لگائی جاسکتی ہے۔ عرب دنیا یقینا فکر مودودی کی پیغامبری کے لیے تا قیامت ان کی احسانمند رہے گی۔ کیا یہ اسی احسانمندی کی ایک ہلکی سی جھلک ہے کہ سعودی عرب کی ایک سڑک کا نام **شارع مسعود عالم ندوی** رکھا گیا ہے؟

الضیاء کا یہ نوجوان مدیر و صحافی جو اپنی زبان کی صحت کے لیے پوری عرب دنیا میں مشہور ہوچکا تھا وہ اپنی دنیاوی زندگی کو عیش و عشرت کے ساتھ بسر کرسکتا تھا لیکن تحریک اسلامی کے اس بیمار اور کمزور سپاہی نے (جو نہ جانے کتنے ہی تندرستوں اور طاقتوروں پر بھاری تھا)، عقبیٰ کی زندگی کو ترجیح دی۔ وہ جب تک جئے حق کی ترجمانی کا فریضہ نبھاتے رہے۔ وہ تنقید کافی بیباکی سے کرتے تھے پھر چاہے ان کے مشفق مولانا مودودی ہوں یا دیرینہ رفیق علی میاں ندوی۔ آزمائش زنداں سے بھی گزارے گئے اور ہر حال میں رفاقت کا حق ادا کردیا شاید اس لیے ان کی رحلت پر مولانا مودودی اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین!